ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

Vol.6 No.2 2022

مجید امجد: جدید شاعری کا اہم سنگِ میل

***ڈاکٹر شائستہ حمید خان**

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور۔

****ڈاکٹر ریحانہ کوثر**

صدر شعبہ اردو، لاہور کالج فار ویمن یونیورسٹی، لاہور۔

*****علی مرتضیٰ**

لیکچرر اردو، گورنمنٹ شالیمار گریجوایٹ کالج، لاہور۔

ABSTRACT

Majeed Amjad deserve high ranking in modern Urdu poem. Basically he is genuinely a modern Urdu Nazam's poet. His poetry has separtly identification due to his unique topics and style. The poet very beautifully established a deep linkage between the inner and outer world. He showed internal sentiments passion with reference to external materialistic objects. The poetry of Majeed Amjad is an important milestone in Urdu literature in the field of modern poetry and this article covers an analytical research based study of a great modern poet.

Keywords: *Majeed Amjad, Modern Urdu poem, Poetry, Milestone*

مجید امجد کا نام اُردو شاعری میں ایک خاص مقام کا حامل ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے مجید امجد کے ادبی قد کاٹھ میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ زندگی میں تو اُن کو اتنی گہرائی سے نہ سمجھا گیا لیکن اُن کے انتقال کے بعد معاشرے کے عام رواج کے مطابق اُن کی عظمت کو جانا بھی گیا اور پہچانا بھی گیا اور ایک سروے کے مطابق بیسویں صدی کا بڑا نظم نگار بھی تسلیم کیا گیا۔

آغاز وارتقا کے تناظر میں جدید اُردو نظم کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے تو اس کی تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ نظم کی ترقی کا یہ سفر کوئی آسان مرحلہ نہ تھا۔ یوں تو نظم کا آغاز قدیم دور سے ہی ہو چکا تھا۔ مختلف موضوعات پر نظمیں لکھی اور پڑھی جاتی تھیں۔ مگر مروجہ اُردو نظم کے اصل بانی نظیر اکبر آبادی قرار پائے۔ "جاڑے کی بہاریں"، "آدمی نامہ"، "برسات کی بہاریں"، "چڑیوں کی تسبیح"، "موت"، "ہولی کی بہاریں"، "بنجارہ نامہ"، "پہیے کی فلاسفی"، "چپاتی"، "تربوز"، "تل کے لڈو"، "آٹے دال کا بھاؤ"، "موتی"، "آگرے کی تیراکی" وغیرہ نظیر کی نظموں کی بہترین مثالیں ہیں۔ تھوڑا آگے بڑھیں تو سر سید احمد خاں کی ادبی تحریک، انگریزی ادب اور مغربی خیالات نے اُردو نظم کی ترقی اور بڑھوتری کے لیے مزید راہیں ہموار کیں۔

حالی اور آزاد نے مل کر انجمن پنجاب کے تحت جہاں موضوعاتی شاعری کے رجحان کو فروغ دیا وہاں شبلی نعمانی، اکبر الہ آبادی، اسمٰعیل میرٹھی، مولانا ظفر علی خان، جوش ملیح آبادی اور علامہ اقبال نے نظم کو مزید استحکام بخشا۔ اس لیے با آسانی کہا جا سکتا ہے کہ اُردو نظم نظیر سے لے کر حلقہ ارباب ذوق تک ارتقائی سفر سے گزری لیکن جو عروج اس کو میراجی، راشد اور مجید امجد کی بدولت حاصل ہوا وہ کسی اور دور میں نہیں ہوا۔ نظم کی جو ترقی یافتہ شکل آج ہمارے سامنے ہے۔ مجید امجد اس میں ایک اہم اور منفرد موڑ ثابت ہوئے۔ جدید نظم نگار شعرا میں ان کا قد خاصا بلند ہے۔ تنوع اور رنگارنگی ان کی نظموں کا اہم خاصہ ہے۔ ان کی شاعری کے موضوعات زندگی کی مختلف جہات کا احاطہ کرتے ہیں۔ مجموعی زندگی جس آشوب اور مشکل میں مبتلا ہے اور انسان عذاب کی جن راہوں سے گزار رہا ہے اسی کا اظہار ان کی شاعری کا بنیادی خاصہ ہے۔

مجید امجد کی شاعری کا دورانیہ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۷۴ء تک محیط ہے۔ "شبِ رفتہ" کے نام سے ایک شعری مجموعہ اُن کی زندگی میں ۱۹۵۷ میں شائع ہو چکا تھا جبکہ اُن کی بقیہ شاعری کو اُن کی وفات کے بعد کتابی صورت میں چھاپا گیا۔ اس سلسلہ میں اُن کے تمام مسودات کو ایک کمیٹی کے زیر اہتمام "شب رفتہ کے بعد" کے نام سے اشاعت کے مراحل سے گزارا گیا۔ بعد ازاں گلاب کے پھول (مرتبہ، خالد شریف) مرے خدا مرے دل (مرتبہ تاج سعید) ان گنت سورج (مرتبہ خواجہ محمد زکریا) طارق ابد (مرتبہ شیمم حیات سیال) کے ذریعے اُن کے کلام کو مرتب کیا گیا۔ بعد ازاں ۲۰۰۳ء میں "کلیات مجید امجد" (۱) ایک بالکل اور نئی صورت میں قارئین کے سامنے آئی۔ انہوں نے کلیات کو چار مختلف حصوں میں تقسیم کر کے اس کے اندر سنہ کے اعتبار سے مجید امجد کی شاعری مرتب کی۔ جس کی ترتیب کچھ یوں ہے:

شب رفتہ	۱۹۳۵ء تا ۱۹۵۸ء تک کی شاعری	پہلا حصہ
روزِ رفتہ	۱۹۳۲ء تا ۱۹۵۸ء	دوسرا حصہ
امروز	۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۸ء	تیسرا حصہ
فردا	۱۹۶۸ء تا ۱۹۷۴ء	چوتھا حصہ

مجید امجد نے پابند، معرٰی Blank verse اور آزاد Free verse تینوں اقسام میں نظمیں لکھی ہیں لیکن ان کے کلام کا بڑا حصہ آزاد نظم کی ہیئت میں ہے۔ ان کی آزاد نظموں پر میراجی اختر الایمان کا اثر نمایاں نظر آتا ہے۔ میراجی اور اختر الایمان کی طرح خیال کے اعتبار سے مصرع ترتیب دیتے ہیں اور کہیں کہیں پیراگراف کی شکل جبکہ پہلے مصرع کا خیال دوسرے مصرع میں پورا ہوتا ہے۔ ان کے یہاں ہمیں راشد کا اثر بھی نظر آتا ہے جس میں مشکل لفظیات کا استعمال شامل ہے جس پر فارسی کا غلبہ ہوتا ہے۔ لیکن دوسری طرف اگر دیکھا جائے تو شاعری کی جو شکل اُن کے پہلے دور کے کلام میں دکھائی دیتی ہے وہ اُن کی آخری دور کی نظموں میں مفقود ہے۔ اس لحاظ سے اُن کے آخری دور کی نظمیں اہمیت کی حامل ہیں۔ قاری کے لیے اُن نظموں کو سمجھنا اور پرکھنا آسان نہیں۔ انہیں سمجھنے کے لیے خاص طرح کے مطالعے کی ضرورت ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ادبی اور تخلیقی حلقوں میں اُن کی آخری دور کی نظموں کے حوالے سے کوئی قابل قدر تحقیق و تنقید موجود نہیں ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ خود مجید امجد نے اپنی اولین شاعری اور نظموں میں جو نت نئی ہیئتیں اور سانچے دریافت کیے تھے وہ اپنی آخری دور کی نظموں میں اُن سے انحراف کرتے نظر آتے ہیں۔ اگر کوئی شاعر چار دہائیوں یا عشروں تک ایک خاص قسم کی

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.2 2022

شاعری کرتا ہے اور آخر میں اپنے انہی طے شدہ ہیئتوں، تلازموں، ترکیبوں اور سانچوں کا استعمال ترک کر دیتا ہے تو اس قسم کی شاعری فوق شاعر Super poetry کی مثال بن جاتی ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر اس کی مثال بن جاتی ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

> "مجید امجد کی ان نظموں کی اہمیت کا اہم زاویہ یہ ہے کہ یہ فوق شاعری Super poetry کی مثال ہیں۔ مجید امجد کی آخری دور کی نظمیں اس مفہوم میں فوق شاعری نہیں کی ان میں شاعری سے نفسی سطح پر برتر کوئی چیز پیش کی گئی ہے۔ شاعری سے برتر چیزیں ممکن اور موجود ہیں، مگر وہ شاعری کے وجودیاتی نقطہ نظر سے "ناشاعری" ہوتی ہے۔۔۔ مجید امجد کی زیر مطالعہ نظمیں اس مفہوم میں "فوق شاعری" ہیں کہ یہ مجید امجد کے ان شاعرانہ تصورات سے فیصلہ کن انحراف کرتی ہیں، جو انہیں چار دہائیوں تک عزیز رہے"۔ ۲

زیرِ بحث نظمیں "کُلیات مجید امجد" کے آخری حصے "فردا" سے لی گئی ہیں جس کا دورانیہ ۱۹۶۸ء تا ۱۹۷۴ء یعنی اُن کی سن وفات تک ہے۔ اس سلسلہ کی پہلی کڑی اُن کی نظم "دامنِ دل" ہے جو انہوں نے ۱۹۷۰ء میں تخلیق کی۔ ملاحظہ ہو:

سدا رہے یہ ڈھلا ڈھلا اور ستھرا ستھرا
زندہ،
اپنے وجود کی اصلیت سے منور،
اس پر میل نہ رہنے پائے،
اس کو گھُ دے،
اس کو سل پہ پٹخ دے،
اس کو توڑ مروڑ نچوڑ دے، کس دے،
اس کو جھٹک دے،
اس کی گیلی شکنیں چن لے
اس کو سچے سکھ میں سکھا! ۳

مجید امجد اپنے رجحان ساز اسلوب اور کثیر الجہتی کے باعث اُردو شاعری میں ایک منفرد اور الگ حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک ایسی شخصیت جو اُردو شاعری میں اسلوبیات کے ایک خاص زاویے سے پہلی اور اب تک کی آخری منفرد شخصیت ہے۔ نظم "دامن دل" اُن کی تخلیق کا اعلیٰ نمونہ ہونے کے ساتھ ساتھ سہل ممتنع کی بہترین مثال بھی ہے۔ جہاں ایک طرف مجید امجد نے اس نظم میں دل کی صفائی کے حوالے سے سادہ ۱۰ اور آسان مصروں میں باریک نکات عمدگی سے بیان کر دیے ہیں۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے کہ:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی

خودی اور خودی سے متعلقہ اسبابِ و عمل کو اسباب و علل کو اقبال اور دیگر شعراء نے تفصیلاً اپنی شاعری میں بیان کیا ہے۔ مجید امجد کی اس نظم میں بھی خودی اور تصوف کی نمایاں جھلک نظر آتی ہے۔ یہ ایک ازلی حقیقت ہے کہ کسی بھی انسان کے لیے پاکیزہ اور نیک دل کسی نعمت سے کم نہیں دل کی ہی صفائی و پاکیزگی اور معصومیت انسان کے چہرے سے بھی جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔ ان کا دل دردمندی اور سوز سے معمور نظر آتا ہے سو اُن کی تمام شاعری میں حزن و ملال کا رنگ نظر آتا ہے۔ مجید امجد کی شاعری اپنے آہنگ اور رنگ کے حوالے سے بلاشبہ ایک منفرد شاعری ہے۔ اور ان کی اس نظم میں وہ رنگ اور آہنگ مزید نکھر کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری اس حوالے سے اپنے نادر خیالات کا یوں اظہار کرتے ہیں:

> "۔۔۔اس نظم میں پنجاب کے صوفیا کی مخصوص پاکیزہ آوازوں کی بازگشت ہے دل کی صفائی کے سارے مرحلے یہاں سمٹ آئے ہیں۔ مقامی وجود کی یہ لہریں اس کی پوری شعری دنیا میں دوڑتی نظر آتی ہیں۔ امجد کے اسلوب میں مقامی وجود کو زبردستی دبا دبا کر داخل نہیں کیا گیا ہے۔ یہ تو اس کی شعری تجربے کا نامیاتی حصہ ہے جو اس کے خون میں تیرتا ہے۔ اعصاب میں سرسراتا ہے اور اس کی شعری واردات کا حصہ بن کر چمکنے لگتا ہے۔ مقامی وجود کی خوشبو امجد کے تخلیقی عمل میں یہ لہر ہر سمت پھیلی ہوئی ہے اور نئی اُردو شاعری کے لیے یہ تجربہ ایک نئی بشارت کی حیثیت رکھتا ہے"۔ ۴

اسلوب کے لحاظ سے یہ نظم بہترین شاہکار ہے۔ مجید امجد کے ہاں لفظوں کی تکرار عام سی چیز ہے۔ لیکن لفظوں کی یہی تکرار اُن کی نظموں کو موسیقیت سے ہمکنار کر دیتی ہے۔ ڈھلا ڈھلا، ستھرا ستھرا موسیقیت اور تکرار لفظی کی اعلیٰ مثال ہیں۔ اسی طرح کلمہ اور مہمل کی عمدہ مثال پیش ہے۔ "توڑ مروڑ" فارسی کو عام روز مرہ الفاظ اور زندگی سے ہمکنار کرتا ہے۔ پٹخ دے، کس وے، جھٹک دے ردیف قافیہ کی منفرد مثالیں ہیں۔ اور آخری دو مصرعوں میں نظم کا پورا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے:

اس کی گیلی شکنیں چل لے
اس کو سچے سکھ میں سکھا!

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.2 2022

اپنے دل کو ہر طرح کے میل کچیل سے صاف کر کے اس کو پاکیزہ بنالو اور اس کو امن و سکون کی دھوپ میں سکھا تا کہ اس کے اندر موجود ہر طرح کی کثافت دور ہو جائے۔ نظم کو ایک سے دو مرتبہ پڑھنے کے بعد دھوبی گھاٹ کا علامتی استعارہ بھی واضح ہوتا ہے۔ جس طرح دھوبی کپڑے کو صاف کرنے کے لیے اُسے لپیٹ کر پتھر کی سِل پر پٹختا ہے۔ اس میں سے پانی نچوڑنے کے لیے اُسے توڑتا مروڑتا ہے اور پھر اُسے کہتا کستا ہے جھٹکتا ہے بالکل اسی طرح اپنے دل کی صفائی کی طرف دھیان کرتا کہ تیرا دل ایک صاف کپڑے کی مانند دھلنے کے بعد اجلا اور چمکدار ہو جائے۔

مجید احمد کی شاعری میں مقامیت اور تصوف کے رنگ کے علاوہ جو چیز جابجا نظر آتی ہے وہ اُن کی نظموں میں قریبی اشیاء سے محبت اور اُن کے وجود کا گہرا احساس ہے۔ اُن کے ارد گرد اور آس پاس کی جاندار اور بے جان اشیاء کا اظہار معمول کی بات ہے اس لیے مجید امجد کو تمام انسانیت کا شاعر کہنا بے جانہ ہوگا۔ انہوں نے اپنی نظموں میں نہ صرف انسانوں بلکہ چرند پرند، کھیت کھلیانوں، فصلوں، باغوں، درختوں اور شاخوں پر قلم اٹھایا ہے اسی سلسلہ میں اُن کی ایک نظم ''جلسہ'' پیشِ خدمت ہے۔ ملاحظہ ہو:

آج سحر دم میں نے بھی رک کر وہ جلسہ دیکھا
پکی سڑک کے ساتھ، ذخیرے میں، ٹوٹی سوکھی شاخوں کے
چھدرے چھدرے سائبانوں کے نیچے،
شیشم کے گنجان درختوں کے آپس میں جڑے تنے، سب
اس جلسے میں کھڑے تھے!
ایک گزرتے جھونکے کی جھنکار ذخیرے میں لرزاں تھی،
''آس پاس کی کالی رسموں کے سب کھیت ہرے ہیں،
اور یہ پانی تمہاری باری کا تھا،
اب کے بادل دریاؤں پر جا کر برسے،
ان سے تمہارا بھی تو عہد نامہ تھا
اب کیا ہوگا؟
چلتے آروں کے چرتے گرتے جسمو، پاتالوں میں گڑ جاؤ ورنہ''
اس تیکھی حجت میں اتنی سچائی تھی
جتنے ان پیڑوں کے سب اک ساتھ ہلے غصے میں
اور میری آنکھوں میں پھر گئے دُکھ اک ایسے خیال کے، جس کی ثقافت جانے کب سے اپنا مسکن ڈھونڈھ رہی ہے! ۵

اس نظم کا منظر نامہ یہ ہے کہ پکی سڑک کے ساتھ شیشم کے گنجان درخت آپس میں جڑے کھڑے ہیں جیسے جلسہ ہو رہا ہے۔ شاعری کے میدان میں اچھا شاعر وہی ہے جو زندگی کے نمائندہ مظاہر کو ڈرامائی یا افسانوی معنویت کے ساتھ پیش کرتا ہے اور اس کے لیے واقعات کا تانا بانا بنتا ہے۔ کردار تراشتا ہے۔ منظر کشی کرتا ہے اور علامتیں اور استعارے ڈھونڈ کر لاتا ہے۔ یہی مجید امجد کا کمال ہے کہ وہ فرد کے وجود کو دنیاوی وجود کے ساتھ یوں جوڑ دیتا ہے کہ پوری کائنات ایک زندگی وجود محسوس ہونے لگتی ہے۔ یہ بات تو طے ہے کہ وجود کے اثبات کے لیے وجود بذات خود یعنی دنیا اور دنیا میں موجود جو سری اشاء کا ہونا ضروری ہے کیونکہ اس سب کے بغیر فرد کے وجود کی تفہسیم ہو ہی نہیں سکتی اور یہ مجید امجد کے شعرا کا کمال ہے کہ وہ جب بھی فرد کے ہونے کا احساس دلاتا ہے تو دُنیا اور دُنیا کی اشیا کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔

زیرِ بحث نظم میں شروع سے آخر تک ایک ردھم ہے ایک تلخ حقیقت کا بیان ہے جسے مجید امجد نے درختوں کے علامتی استعارے کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ چلتے آروں کے آگے چرتے گرتے جسم پاتالوں میں گڑ جائو میں کتنا بڑا پیغام موجود ہے۔ کتنا عزم اور حوصلہ موجود ہے۔ اپنی ہستی اور اپنے وجود کی تابندگی کے لیے اس سے بڑھ کر کیا پیغام ہو سکتا ہے لیکن آخری مصرعہ میں مجید امجد جو بات کہہ رہا ہے یہ اس کا وہ احساس ہے جو قاری کو دل گرفتہ کر دیتا ہے۔ وہ تو فرد کو باحوصلہ اور باعزم دیکھنا چاہتا ہے۔ اپنے حق کے لیے لڑنا اور آگے بڑھنا بھی تو فرد کے وجود کا لازمی خاصہ ہے۔ یہاں بھی دو باتیں ذہن میں رکھنا ضروری ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہمارے سماج کی قدریں پلٹ ہو رہی ہیں۔ فرد کی ذات بے سمتی کا شکار ہے اور دوسرا یہ کہ کچھ ظالم اور جابر لوگ وہ ہیں جو فرد کو اس کا حق دینا ہی نہیں چاہتے اور اسی وجہ سے اور میری آنکھوں میں پھر گئے دکھ اک ایسے خیال کے جس کی ثقافت جانے کب سے اپنا مسکن ڈھونڈ رہی ہے!

تکنیکی لحاظ سے یہ نظم منظر کشی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے قاری کی آنکھوں کے سامنے گھنے درختوں کا وہ جھنڈ گھوم رہا ہے جسے ساہیوال جاتے ہوئے راستے میں جابجا دیکھا جا سکتا ہے۔ ''سحر دم'' کی ترکیب نظم کو اور زیادہ پر اسرار بناتی ہے۔ یہاں ایک دفعہ لفظی تکرار کا سہارا لے کر لفظ جھلارے جھلارے سے نظم کی خوبصورتی میں اضافہ کیا گیا ہے۔ ''جھونکے کی جھنکار'' کالی رسموں کے کھیت تیکھی محبت بلاشبہ عمدہ تراکیب ہیں جو اپنی طرز میں منفرد بھی ہیں۔

مجید امجد کی نظموں کا ایک بڑا حصہ مدھم اور زیریں آہنگ سے عبارت ہے اور اس میں رجز کے بجائے رزمیہ کیفیات نمایاں ہیں مگر افعال، تشبیہات، علامات اور کیفیات کی تکرار کے سبب اُن نظموں میں ایک ایسا صوتی شکوہ پیدا ہو جاتا ہے جو مجید امجد کے تخلیقی تحرک کی علامت ہے۔

مجید امجد کا ظاہر اور باطن بالکل سادہ تھا اور وہ زندگی کو بھی سادگی کی نظر سے ہی دیکھنا چاہتے تھے یہی وجہ ہے کہ اُن کی نظموں میں ثواب، عذاب، نیکی، بدی، پیار، نفرت، اچھائی برائی کے تلازمے عام طور پر نظر آتے ہیں اس سلسلے میں اُن کی نظم ''عذاب'' ملاحظہ ہو:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.6 No.2 2022

اپنے ثواب میں نیکی اپنے عذاب سے غافل رہ جائے، تو چھن جاتی ہیں جینے کی سب خوشیاں
ٹوٹ کے رہ جاتا ہے بھروسا اپنا، اس کی نیکی پر،
گھل جاتی ہے، اپنے آپ اپنے سے نفرت میں، اپنی ہر اچھائی،

اپنے قلب کو اب کوئی چاہے جس قالب میں بھی ڈھالے
اب سب پچھتاوے ٹیسیں ہیں
اب دنیا کی آخری حد تک پھیلے ہوئے ان بادلوں کے نیچے یوں پلکیں جھکا کر اپنے غموں کی پرستش بے مصرف ہے
باہر اب صرف آنکھیں دیکھتی ہیں۔۔۔۔اور
باقی سارے بدن تیزابوں کے تالابوں میں تحلیل ہیں
آنکھیں دیکھتی ہیں۔۔۔اور اس سے زیادہ کیا دیکھیں گی،
سارے خُداؤں نے منہ پھیر لیے ہیں۔۱۹۸۰۔۸۔۳۰۔ ۶؎

جب بھی کسی معاشرے میں انتشار و اغتراق بڑھتا ہے اور مذہبی اقتدار اور سماجی روایات دم توڑتی ہیں تو فرد بحیثیت فرد نظر انداز ہوتا ہے اور اس ے وجود کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے کیونکہ یہ لمحہ وجود کی نفی کا لمحہ ہوا کرتا ہے اور موجود کے لیے نفی کبھی بھی قابل قبول نہیں ہوتی۔ موجود تو اثبات اور اپنی پہچان چاہتا ہے۔ اس لیے وہ موضوعیت اور داخلیت کی طرف رجوع کرتا ہے۔ دنیا کو اپنے جذب دردوں کے حوالے سے دیکھتا ہے اور پرکھتا ہے اور ایسے میں معروض سے کٹ کر ایک نئے طرز کی بنیاد رکھتا ہے۔ ایسی زندگی جو اس کی خود آگہی اور خود شناسی کا پرتو ہوتی ہے۔ کیونکہ موجود کو یہ عرفان حاصل ہوا ہے کہ وہ معروض کی کسی بھی شے سے مماثلت نہیں رکھتا وہ اپنے آپ سے یکتا اور منفرد ہے یہی وجدان مجید امجد کے پاس وجدان مجید امجد کے ہاں بھی ملتا ہے۔

نظم عذاب کے ڈانڈے بھی مندرجہ بالا افکار سے ملتے ہیں۔ نظم کا پہلا مصرعہ:

اپنے ثواب میں نیکی اپنے عذاب سے غافل رہ جائے تو قاری کے لیے سوچنے اور تحقیق کی مزید راہیں کھول دیتا ہے۔ جہاں خوشی وہاں غم، روشنی کے ساتھ تاریکی، ثواب کے ساتھ عذاب، نیکی کے ساتھ بدی، جنت کے ساتھ دوزخ یہ تمام آپس میں لازم و ملزوم ہونے کے ساتھ ساتھ زندگی جینے کا اصل مزہ بھی ہیں۔ اگر انسان کو اپنے انجام کی خبر نہ ہو یا اُس کے حوالے سے تشویش نہ رکھتا ہو تو وہ زندگی بے کار ہے۔ مجید امجد اس نظم میں بھی عام آدمی کو حوصلہ دیتا ہے کہ آگے بڑھو کیونکہ یہ سب پچھتاوے کی باتیں ہیں۔ آنکھیں بند کر کے اپنے غموں میں کھڑے رہنا یا اُن پر آنسو بہاتے رہنا بے سود ہے۔ باہر دنیا جیسی بھی ہے۔ اٹھو اور آگے بڑھو ہمت کرو کیونکہ یہاں تو ہر طرف تیزابوں کے تالاب ہیں۔ جن میں انسان ڈوب رہے ہیں جبکہ سارے دنیاوی خداؤں نے بھی منہ پھر لیے ہیں۔

مجید امجد کی یہ نظم تکنیک کے حوالے سے بہترین بُنت میں تخلیق کی گئی ہے۔ صنعت تضاد کا استعمال اعلیٰ درجے کا ہے۔ پچھتاوے کی لٹیں، تیزابوں کے تالاب، غموں ی پرستش بہترین استعاراتی تلازمے ہیں۔ نظم میں ہر لائن کے آخری الفاظ اگلی لائن کے ابتدائی الفاظ میں اور ہر مصرعے کی آخری کیفیت اگلے مصرعے کی ابتدائی کیفیت میں دہرائی جارہی ہے۔

یہاں افعال اور صفات کی کیفیات اور منظر نامے کی داخلی اور خارجی شکلیں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

"اب دنیا کی آخری حد تک پھیلے ہوئے ان بادلوں کے نیچے ہوں"

اور

باقی سارے بدن تیزابوں کے تالابوں میں تحلیل ہیں۔ یہاں گہرائی میں اضافہ اور کیفیت میں اور شدت پیدا ہو گئی ہے۔

کسی بھی عہد کی فضا عام طور پر تہ در تہ ہوتی ہے۔ جدید عہد میں انسانی وجود کو مطلق و خود رفتار قرار دیا گیا ہے۔ اور خود مختاری سے وہی مطلب لیا گیا ہے جو خدا سے منسوب ہے۔ ایک طرح سے خود مختار انسانی وجود کے خدا کے متبادل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ انسانی وجود، خدا کی مانند ہی تصرف اور اختیار کا جور چرچا رہا ہے۔ انسان کو یہ اختیار تو صرف اور صرف اُسے اپنے ہم نفس انسانوں ی فلاح و بہبود کے لیے دیا گیا تھا۔ لیکن اس کے برعکس انسانی وجود کے اس خدائی تصور نے دنیا کو انسانی خوابوں اور عزائم کے تحت تشکیل دینے کی کوشش شروع کر دی۔ جس کی وجہ سے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوا اور دنیاوی خداؤں نے اپنے ہی بھائیوں کا گوشت نوچنا شروع کر دیا۔ اس حوالے سے مجید امجد کی نظم "حرص" ملاحظہ ہو:

اوروں کی کیا کہیے، خود میرا دل بھی انگاروں کا مطبخ ہے،
سدا میری آنکھوں میں اک وہ کشش دہکتی ہے، جو
سب کو اپنی جانب کھینچ کے میرے وار کی زد میں لے آتی ہے،

سب کچھ میری طلب کی تشنگیوں کے دہانے پر ہے،
انگاروں کے اس مطبخ میں گرنے کو ہے

گاڑھا، لجز، لہو، اک وہ کیلوس جو انگاروں کا استحالہ ہے
اس میرے دل کی کالی قوت ہے، میں جس کے بس میں ہوں

یہ قوت مجھ سے کہتی ہے
دیکھ، میرے انگارے میری تڑپ کا انگ ہیں، اب کچھ تو اُن کی خاطر بھی،
اور انگارے اگلتی سانسوں کے ساتھ اب میں
اس دنیا کے اندر، اپنے شکار کی تلاش میں
اک اک روح کی گھات میں،
اک اک روح کے سامنے، سوالی بن کے کھڑا ہوں
میرے دل میں انگاروں کے دندانے پیہم جڑتے اور کھلتے ہیں
باہر کسی کرم کی بناوٹ میں ہونٹ ایک انوکھا ٹھہرا ٹیڑھا زاویہ سا ہیں،
کون مجھے اب پہچانے گا،
کس طرح ہنس ہنس کر مجھ سے
ملتی ہے دنیا، بدبخت ۱۹۷۰۔۱۰۔۱۰ ء

اُردو شاعری کا مزاج کچھ ایسا ہے کہ اس میں حسن و عاشقی، لطافت و نفاست اور سرشاری و سرخوشی کی کیفیات بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ اُردو شاعری میں صرف ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر کچھ ادب ایسا تخلیق ہوا جو شاید "نفاست" کے زمرے میں نہیں آتا تھا۔ بدصورتی، اور زندگی کی کریہہ تصویریں تو اُردو شاعری کم ہی پیش کر سکی ہے۔ مجید امجد کے ہاں بھی عمومی یہی رویہ موجود ہے۔ وہ ذوق جمال کا بہت دھیان رکھتا ہے لیکن عصری تقاضوں کی فرد کی بے سمتی اور اقدار کی شکست و ریخت نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ فرد کی حقیقی صورت حال کو اجاگر کرے اور یوں وہ وجودیوں کے قریب آن پہنچا۔

وجودی فلاسفہ کے نزدیک امتلا یا گھن کا تجربہ بے حد یا کیف اور گھناؤنا ہے۔ مگر یہ تجربہ فرد کے وجود کے اثبات کا باعث بنتا ہے۔ مجید امجد کے ہاں صرف چار یا پانچ جگہوں پر ایسی صورتِ حال ہے کہ جہاں گھن یا امتلا کی کیفیت فرد کو اس کے اثبات کی طرف دھکیلتی نظر آتی ہے۔ Nausea کی بہترین مثال مجید امجد کے ہاں نظم مسلخ میں بھی نظر آتی ہے۔ لیکن ایک ایسا وقت آیا کہ مجید امجد کے ہاں یہ رویہ متروک ہو گیا اور کئی دہائیوں تک انہوں نے اس کا استعمال ترک کیے رکھا۔ جو کہ بالآخر ۱۹۷۰ء کی دہائی میں نظم "حرص" میں صرف آخری دفعہ نظر آیا۔ شاید مجید امجد نے اُردو میں ایک جدید رویے کو ایک دفعہ پھر متعارف کروانا چاہا تھا مگر یہ بات شاید اُسے خود ہی اچھی نہ لگی اور اس نے اس سلسلے کو ترک کر دیا نظم "حرص" کا یہ مصرعہ گاڑھا، لجز، لہو، اک وہ کیلوس جو انگاروں کا استحالہ ہے۔ میں اس کی نمایاں جھلک نظر آتی ہے۔

اس پوری نظم کی ساری کہانی "ضمیر بد" کی کہانی ہے۔ غیر خود آگاہ ہجوم کے وغیروں کا اظہار ہے۔ جس کے پس منظر میں آگہی کی خواہش بھی محسوس ہوتی ہے۔ اس نظم میں استعمال کی گئی ترکیبوں کے معانی کا جائزہ لیا جائے تو وہ یوں ہیں:

استحالہ:	ایک حالت سے دوسری حالت میں بدلنا، عدم امکان
مطبخ:	کھانے پکانے کی جگہ، چولہا
تشنگیوں:	تشنگی کی جمع، پیاس
دہانے:	منہ، دہن، سوراخ کا سرا
لجز:	گاڑھا، چپکنے والا
لہو:	خون
کیلوس:	غذا ہضم ہونے کی حالت کا پہلا مرحلہ
انگ:	حصہ

یعنی شاعر کا اپنا دل انگاروں کی بھٹی میں جل رہا ہے۔ اُس کی آنکھوں کی چمکدار کشش جو اس کی طرف سب کو متوجہ کرتی ہے۔ اصل میں اُس لالچ اور حرص کی چمک ہے جو اُس کے شکار کو پھانسنے کا باعث بنتی ہے۔ ہر چیز اس کے لالچ کا نشانہ بنتے ہوئے اس کی پیاس کو کم کرنے سے قاصر ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ہر شے اُس چولہے میں گرنے کو ہے جو اُس کے دل میں ازل سے جل رہا ہے۔ جلنے کی وہی طاقت اُسے اس بات پر اکساتی ہے کہ یہ جلنا اس کی تڑپ کا حصہ ہے اس لیے یہ تمہارا ازلی حق ہے کہ دنیا میں اپنا شکار کر کے اُس پر حملہ آور ہو جاؤ۔ ایک خونخوار درندے کی طرح اس کی حرص کے لمبے لمبے دانت شکار پھانسنے کے لیے مسلسل جڑتے اور کھلتے ہیں۔ یہاں مجید امجد نے علامتی طور پر درندے کو بھی استعمال کیا ہے۔ جو کہ ہر چیز ہڑپ کرنے کے لیے تیار بیٹھا ہے۔ دوسری طرف منافقت کا پول بھی کھول دیا ہے اور بتایا ہے کہ دنیا کس قدر منافقت پسند ہے وہ جانتی بھی ہے کہ اس خونخوار درندے سے اُسے نقصان پہنچنے والا ہے لیکن پھر بھی وہ بدبخت دنیا ہنس ہنس کر ملتی ہے۔

مجید امجد کی اس نظم میں اُردو الفاظ کے ساتھ ہندی الفاظ کا استعمال بھی ملتا ہے۔ مثلاً مسطح، الگ، گھات وغیرہ۔ اُن کی شاعری میں الفاظ اپنی روایت کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ جو کہ ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ انگاروں کا مسطح، دہکنا، بہترین تلندعے ہیں۔ کیفیات کے مرحلہ وار اظہار نے ان کی شاعری کو ایسا رنگ اور آہنگ بخشا ہے جو ان کے ہم عصروں کے ہاں نظر نہیں آتا۔

حواشی

۱۔ محمد زکریا، خواجہ، کلیات مجید امجد، طبع لو، ترتیب، تدوین و تحقیق، (فرید بک ڈپو پرائیویٹ لمیٹڈ)، ۲۰۰۳ء۔

۲۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، پاکستانی ادب کے معمار، مجید امجد شخصیت اور فن، ص: ۱۱۱۔

۳۔ محمد زکریا، خواجہ کلیات مجید امجد، ص:۵۷۳۔

۴۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، مجید امجد۔۔۔ آشوب زیست اور مقامی وجود کا تجزیہ، جدید نظم نمبر، مشمولہ اوراق، مدیران، وزیر آغا، سجاد نقوی، لاہور، جولائی اگست ۱۹۷۷ء ص:۲۳۔

۵۔ محمد زکریا، خواجہ، کلیات مجید امجد، ص: ۵۷۴،۵۷۵۔

۶۔ محمد زکریا، خواجہ، کلیات مجید امجد، ص:۵۷۷۔

۷۔ محمد زکریا، خواجہ، کلیات مجید امجد، ص:۵۸۹،۵۹۰۔